ڈاکٹر اسرار
کی
پُر اسرار باتیں

○

مدیر

سید محمود احمد رضوی

○

ناشر شعبہ تبلیغ دار العلوم حزب الاحناف پاکستان
گنج بخش روڈ لاہور

جلد نمبر ۱۳ ، شمارہ نمبر ۷ ، ماہ جولائی ۱۹۸۲ء چندہ سالانہ ۱۵ روپے فی پرچہ ڈیڑھ روپیہ

ضروری نوٹ ، ملک کے سینکڑوں احباب نے رضوان کا شمارہ جون طلب کیا ہے جو دفتر میں بالکل ختم ہوگیا ہے۔ قارئین کرام کے اصرار اور طلب کی وجہ سے رضوان کے اس شمارہ میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے خیالات پہ تنقید و تبصرہ پر مشتمل سابقہ اور حالیہ مضامین کو یکجا جمع کر دیا گیا ہے تاکہ نئے قارئین اس سلسلہ کے تنقیدی مضامین یکجا مطالعہ کر سکیں ۔ جن مستقل خریداروں کو رضوان بابت ماہ جون ڈاک چوروں یا کسی وجہ سے نہیں ملا۔ ان کی خدمت میں جولائی کا شمارہ دوبارہ بھیجا جا رہا ہے۔ جس میں جون کے شمارہ کے تنقیدی مضامین بھی درج ہیں۔

* * *

قواعد و ضوابط (۱) اکثر مستقل خریداروں کے سالانہ چندے عرصہ ہوا ختم ہیں۔ اس کے باوجود رسالہ ان کے نام باقاعدہ جاری ہے۔ براہ کرم وہ سالانہ چندہ ۱۵ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مشکور فرمائیں (۲) خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی خط یا لفافہ آنا ضروری ہے۔ (۳) جو احباب خریدار بننا چاہیں۔ وہ ۱۵ روپے سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ وی پی نہیں کی جاتی (۴) مکتبہ رضوان کی شائع کردہ کُتب کی قیمتوں میں بوجہ گرانی اضافہ ہوگیا ہے۔ ٹائیٹل پر قیمتیں کم لکھی ہوئی ہیں۔ آرڈر کے وقت اس کا خیال رکھیں۔ (۵) اپنا پتہ صاف، خوشخط اور اردو میں لکھا کریں

* * *

ڈاکٹر اسرار کی پُراسرار باتیں

اقامتِ دین کے لیے جزوی کوشش کرنا حماقت ● دینی بیعت یا سیاسی ● پاکستان کے مسلمان مشرک یا مادہ پرست ● روسی انقلاب، مشرکانہ عمل ● جہاد کس سے ● اینٹ کا جواب پتھر سے ● آخر میں مسلح تصادم۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ نئے نئے شگوفے چھوڑتے ہیں۔ بولنے سے پہلے تولتے نہیں اور جو جی میں آتا ہے اگل دیتے ہیں اور اپنی ذاتی رائے کو قرآنی تعلیم کے نام سے پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان کے ل وعمل میں تضاد ہے اور ان کے افکار وخیالات مسلمانوں میں فکری انتشار کا باعث بن رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبہ جمعہ میں کہا ہے، اقامتِ دین کے لیے جزوی کوششوں میں وقت ضائع کرنا حماقت ہے۔ اتنی بات تو درست ہے کہ اقامتِ دین کے لیے اجتماعی کوشش کرنا نور علیٰ نور ہے۔ مگر اقامتِ دین کے لیے جزوی کوشش کو حماقت قرار دینا بہت ہی ذلیل دعویٰ ہے۔ کوئی صاحبِ ایمان شخص اقامتِ دین کے لیے جزوی کوشش کو حماقت سے تعبیر نہیں کر سکتا۔

نیکی خواہ بڑی ہو یا چھوٹی انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پہ وہ بہرحال نیکی ہے کارِ ثواب ہے اور اس باب میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف نیکی کرنے کے عزم وارادہ پہ بھی ثواب عطا فرما دیتا ہے اگرچہ اس کو عملی جامہ نہ پہنایا ہو بلکہ وہ پاک بے نیاز تو اس مسلمان کے نامہ اعمال میں بھی ایک نیکی لکھ دیتا ہے جو اپنی خواہشِ نفس کی بنا پر کسی گناہ کا عزم وارادہ کرتا ہے۔ مگر خدا کے خوف کی وجہ سے

CS CamScanner

اس کا ارتکاب نہیں کرتا (حدیث قدسی بخاری)

غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے اس بندہ کی بھی قدر کرتا ہے جو صرف نیکی کے کرنے کا عزم و ارادہ کرے جو جزوی کوشش سے بھی بہت نیچے درجہ کی چیز ہے اور ڈاکٹر اسرار صاحب نیکی کے لیے جزوی کوشش کرنے والے مسلمان کو احمق قرار دے رہے ہیں۔

اقامت دین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کو عملی طور پر نافذ و جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔ شریعت اسلامیہ کے احکام سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔ اصلاح معاشرہ و تعمیر سیرت کے لیے اسوۂ رسول کی تبلیغ و اشاعت کی جائے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں، پھر خلفاء راشدین، صحابہ کرام و تابعین عظام کے دور میں غرضیکہ جب سے لیکر اب تک اقامت دین کے لیے جزوی کوشش بھی ہوئی ہے اور اجتماعی کوشش بھی لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول نے خلفاء راشدین اور صحابہ کرام و تابعین عظام و آئمہ دین اور مفسرین و محدثین و علماء اسلام میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اقامت دین کے لیے جزوی کوشش کرنا وقت کا ضیاع اور حماقت ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اقامت دین کے لیے جزوی و اجتماعی دونوں طرح کی کوشش کرنے والوں کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دیا ہے۔ سورہ زلزال کی آیت نمبر ۷ میں تو واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کوئی ذرہ بھر نیکی کرے گا اسے دیکھے گا۔ یعنی اس کا اجر و ثواب پائے گا۔ مگر ڈاکٹر اسرار اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول کی تصریح کے مقابل خم ٹھوک کر یہ فتویٰ دے رہے ہیں کہ اقامت دین کے لیے جزوی کوششوں میں وقت ضائع کرنا حماقت ہے۔ فیا للعجب۔

دین کا درد رکھنے والے مسلمان عموماً نیک کاموں کی انجام دہی کے لیے انفرادی و جزوی کوشش ہی کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی اللہ کا بندہ مسجد بنا دیتا ہے کوئی دینی مدرسہ کے قیام میں مدد دیتا ہے۔ کوئی دینی و مذہبی احکام و مسائل پر مشتمل لٹریچر شائع کر کے تبلیغ و اشاعت اسلام میں حصہ لیتا ہے اور کوئی غریبوں اور ناداروں کی امداد و اعانت کے لیے رفاعی ادارے قائم کر دیتا ہے۔ یہ سب نیک کام ہیں اور اقامتِ دین ہی کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب کا خانہ ساز فتویٰ یہ ہے کہ اقامتِ دین کے لیے جزوی کوششوں میں وقت ضائع کرنا حماقت ہے اور کسی نیک کام کی انجام دہی کے لیے جزوی کوشش کو وقت کا ضیاع اور حماقت قرار دینے کا مطلب یہ ہی ہے کہ وہ کام بے کار اور فضول ہے اور یہ کہ فاعل کو اس نیک کام کے کرنے پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا تو اسراری شریعت کی رو سے مسلمانوں کی تمام وہ نیکیاں جو وہ جزوی اور انفرادی طور پر انجام دیتے ہیں سب کی سب اکارت اور دنیا و آخرت میں بے ثمر قرار پاتی ہیں

لاہور کے علماء نے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان پر شرعی گرفت کی تھی جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ پردہ کے احکام کو نافذ کیے بغیر اسلامی سزاؤں کا نفاذ ظلم ہے ظاہر ہے اسلامی سزاؤں کو ظلم سے تعبیر کرنا خالص گمراہی و بد دینی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے تھا کہ وہ صدق دل سے توبہ کرتے اور حدودِ الٰہی کو ظلم نہ کہنے کا عہد کرتے مگر انہوں نے حدودِ الٰہی کو ظلم کہنے سے رجوع نہیں کیا اور اپنے وضاحتی بیان میں پھر اپنے اسی قول کو دہرا دیا ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے وضاحتی بیان میں کہا ہے کہ جہاں تک حدودِ الٰہی کے نفاذ کے متعلق میرے اس قول کا تعلق ہے کہ ستر اور حجاب کے احکام نافذ کیے

بغیر جنسی جرائم کی اسلامی سزائیں نافذ کرنا خود شریعت پہ بھی ظلم ہے اور لوگوں پہ بھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نفاذِ حدودِ الٰہی کی مخالفت کر رہا ہوں بلکہ اس سے میرا مقصد اس پہ زور دینا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ستر و حجاب کے اسلامی احکام بھی فوری طور پہ نافذ کیے جائیں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ڈاکٹر صاحب سخن پروری کے مرض میں مبتلا ہیں یا پھر ان کے علم و فضل کی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے علماء کی شرعی گرفت کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ علماء کو ان کی بیان کردہ وضاحت پہ نہیں بلکہ حدودِ الٰہی کے لیے لفظ ظلم کے استعمال کرنے پہ اعتراض ہے اور شرعاً یہ اعتراض صحیح و درست ہے اور جب تک وہ حدودِ الٰہی کو ظلم کہنے سے رجوع نہ کریں اس وقت تک وہ بری الزمہ نہیں ہو سکتے۔

آج تک تو مسلمانانِ عالم کا یہ ہی عقیدہ اور تصوّر رہا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی کامل و مکمل انقلاب برپا ہوا ہے تو وہ صرف اور صرف حضور سیّد المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ تسلیم کا اسلامی انقلاب تھا۔ جس کی نظیر تاریخ عالم میں پیش کرنی ناممکن ہے لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر اسرار صاحب کی تحقیق یہ ہے۔ اگر ہم بنظر عمیق تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں انقلاب فرانس اور روس کے انقلاب نظر آتے ہیں روس کے انقلاب کو تمام انقلابوں کی ماں کہا جا سکتا ہے کہ اسی میں ایک انقلاب کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ (جنگ لاہور۔۱۰ اپریل ۱۹۸۲ء) اب روس انقلاب کو ایک مکمل انقلاب کہنا اور وثوق کے ساتھ یہ کہنا کہ اسی میں ایک انقلاب کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ قرآن و سنت کی رو سے کہاں تک درست ہے۔

یکم مئی کے اخبارات میں ڈاکٹر اسرار احمد نے تبلیغ کے موجودہ طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس سے فرقہ واریت پھیلائی جا رہی ہے۔ ایک گروہ

جو تبلیغ کر رہا ہے۔ اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ اسلامی انقلاب صرف کتابوں سے نہیں لایا جاسکتا (نوائے وقت یکم مئی)

اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے اس انقلابی بیان کے اجزاء گول مول بلکہ مٹول بلکہ بہت ہی مبہم و مجہول ہیں۔ یقین سے کچھ کہنا ذرا مشکل ہے۔ مگر ان کی طبیعت اور انقلابی رجحانات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے فرقہ واریت پھیلانے والوں سے مراد بریلوی مکتبِ فکر کو لیا ہے یا دیوبندی اور اہلِ حدیث مکتبۂ فکر کو۔ جو گروہ تبلیغ کر رہا ہے۔ مگر اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے مراد آجکل کی تبلیغی جماعت ہو سکتی ہے اور اسلامی انقلاب صرف کتابوں سے نہیں لایا جاسکتا کے جملہ سے جماعتِ اسلامی کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ لٹریچر کے معاملہ میں وہ بہت مضبوط ہے۔ اس حساب سے پورے ملک میں حق و صداقت کی نشانی تو صرف ایک ہی شخصیّت رہ جاتی ہے اور وہ ہے ڈاکٹر اسرار صاحب اور ان کے چند عقیدت مند

البتہ ڈاکٹر صاحب کا یہ قول اپنے مفہوم انتہا پسندی میں بالکل واضح ہے۔ فرماتے ہیں کہ آج پھر مسلمانوں میں الحاد مادہ پرستی اور شرک اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح کہ رسولِ اکرم کے زمانہ میں تھے اور جن کے خلاف آپ نے قرآنی تعلیمات کے ذریعہ جہاد کیا تھا۔ (نوائے وقت یکم مئی ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر صاحب کے اس بیان میں الحاد و مادہ پرستی کے الفاظ سے الحاد و مادہ پرستی ہی مراد ہے۔ جس میں الحاد و مادہ پرستی کا مرض پایا جائے۔ شرعاً وہ ملحد و زندیق

CS CamScanner

اور یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ پاکستانی جھنڈے کو سلامی دینا اور ترانے کو کھڑے ہو کر سننا بھی مشرکانہ عمل ہے۔ (جنگ یکم مئی ۱۹۸۲ء)

اہل علم پر یہ بات واضح ہے غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تعظیم شرک نہیں ہے تعظیم کی بعض صورتیں حرام و ناجائز تو ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ان کا حرام و ناجائز ہونا دلائل شرعیہ سے ثابت ہو جائے۔ مگر وہ تعظیم جو معظم کی عبادت اور عقیدۂ الوہیت سے خالی ہو شرک نہیں ہو سکتی یعنی ہر عبادت میں تعظیم ہوتی ہے۔ مگر ہر تعظیم کا عبادت ہونا ضروری نہیں ہے۔ پاکستانی جھنڈے کو بطورِ تعظیم و اکرام اسلامی دینا یا پاکستانی ترانہ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جانا محض تعظیم ہے۔ جس میں جھنڈے یا ترانے کو خدا یا خدا کا شریک یا اس کی عبادت و پرستش کا عقیدہ نہیں ہوتا اس لیے شرک نہیں ہے

بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی افتادِ طبع اور جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی ہے اس سے مجبور ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ چند اردو کی تفسیریں پڑھ لینے سے قرآنی علوم ان پر منکشف ہو گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے وہ انہیں لائنوں پر چل رہے ہیں جن پر کسی زمانہ میں خارجی فتنہ نے اپنی بنیادوں کو استوار کیا تھا۔ خوارج کا نقطہ ضلالت یہ ہی تھا کہ جو آیات کفار و مشرکین کی شان میں نازل ہوئی تھیں انہیں وہ مسلمانوں پر چسپاں کر کے انہیں کافر و مشرک قرار دے دیتے تھے۔ خارجی تو ایک عرصہ ہوا دفن ہو چکے۔ مگر خارجی ذہنیت آج بھی باقی ہے اور اسی ذہنیت کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب اقامتِ دین کی بات کرتے کرتے انہدام دین تک پہنچ گئے مسلمانوں کو ملحد مادہ پرست مشرک تک کہہ دیا اور تان اس پر آ کر توڑی کہ پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دینا اور کھڑے ہو کر ترانہ سننا بھی مشرکانہ فعل ہے۔

CS CamScanner

جنگ لاہور ۲۲ مئی سنہ ۱۹۸۲ء میں ایک بار ڈاکٹر مذکور نے اپنی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ہے جب تک ملک میں پردہ اور ستر پوشی کا قانون نافذ نہیں ہوتا اس وقت تک زنا آرڈی ننس کے تحت سزا دینا جرم ہے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل کے بیانات میں انہوں نے زنا آرڈیننس کے تحت سزا دینے کو ظلم قرار دیا تھا اور اب جرم قرار دے رہے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ زنا آرڈیننس کسی انسان کی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کے احکامات پر مبنی ہے اور ڈاکٹر صاحب اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول کی مقرر کردہ حدود کو کبھی ظلم کہتے ہیں اور کبھی جرم۔ اور حیرت و افسوس یہ ہے کہ حدودِ خداوندی کو ظلم و جرم ایک ایسے ملک میں کہا جا رہا ہے جس کا نام پاکستان ہے اور جو قائم ہی اسلام کے نام پر ہوا اور جس کے باشندے بھی دل و جان سے اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے خواہاں ہیں اور جس کی موجودہ حکومت بھی اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کی دعوے دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک جاہل سے جاہل مسلمان بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ سزاؤں کے لئے ظلم اور جرم کے الفاظ نہیں استعمال کر سکتا ایسے حوصلے کی جرأت تو اسلام کے کھلے ہوئے دشمنوں، کافروں اور منافقوں کو بھی نہیں ہو سکی۔ جس کا مظاہرہ ڈاکٹر مذکور نے کیا ہے پھر یہ کیسی غلط منطق ہے کہ جب تک پردہ کا قانون نافذ نہیں ہوتا اس وقت تک زنا آرڈننس کے تحت سزا دینا ظلم ہے۔ گویا ڈاکٹر مذکور یہ چاہتے ہیں کہ زانیوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے، ملک میں زناکاری ہوتی رہے اور ملک کی عدالتیں خاموش تماشائی بنی رہیں۔ اور جب کوئی زنا کا مقدمہ پیش ہو تو وفاقی شرعی عدالت کے جج صاحبان یہ کہہ کر زانی کو عزت و احترام کے ساتھ رہا کر دیں کہ ابھی ہم قانونِ ستر و حجاب کے نفاذ کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ نافذ ہو جائے گا تب زنا کے مجرم کو عدالت میں پیش کرنا۔ فی الحال زانی کو اس لئے سزا نہیں دی جا سکتی کہ ستر و حجاب کا قانون نافذ نہیں ہے (معاذ اللہ)

CS CamScanner

ڈاکٹر مذکور نے جنگ ۲۲ مئی میں پھر اپنے اس موقف کا اعادہ کیا ہے کہ قومی پرچم کو سلامی دینا شرک ہے اس فتوٰی میں انہوں نے پاکستان کے ایک تہائی مسلمانوں کو تو مشرک قرار دے دیا ہے اور امید رکھتی چاہیئے جو مسلمان ان کے فتوٰی کی زد سے بچ گئے ہیں انہیں بھی عنقریب شرک و کفر سے نواز دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے انہیں مضحکہ خیز خیالات سے متاثر ہو کر نوائے وقت لاہور کے غیر سیاسی باتوں کے کالم نویس جناب عبدالقادر حسن نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قومی پرچم کو سلامی دینا بھی شرک قرار دیا ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا اور اس کے بعد انہیں مشورہ دیا ہے کہ مہربانی فرما کر ڈاکٹر صاحب اپنی اداؤں پر غور کریں اور انا الحق بننے کی کوشش نہ کریں۔

(نوائے وقت لاہور ۱۲ مئی ۱۹۸۲ء)

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے جارحانہ اور خانہ ساز قرآنی تبلیغ سے مسلمان ذہنی و فکری انتشار کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی رائے کو قرآن کے نام سے پیش کر کے تعلیم یافتہ خواتین اور حضرات کو دینِ اسلام سے بدظن کر رہے ہیں۔ اس لیے علمار حق کو تشویش ہے البتہ لادین عناصر بہت خوش ہیں کہ ان کا مقصد اسلام کے علمبرداروں ہی کے ہاتھوں پورا ہو رہا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی اور ہمیں بھی دین کے معاملہ میں بے جا غلو اور تشدد سے بچنے کی توفیق رفیق عطا فرمائے (امین)

ڈاکٹر صاحب روسی انقلاب کو تمام انقلابوں کی ماں قرار دیتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ روسی انقلاب ہی میں ایک مکمل انقلاب کی جھلک نظر آتی ہے۔ روسی انقلاب سے ان کو اس قدر محبت و عقیدت صرف اس لیے ہے کہ وہ اپنے خانہ ساز قرآنی انقلاب کو بھی ٹھیک انہیں خطوط پر برپا کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے روس نے برپا کیا تھا اور جیسے روس نے اپنی فکر کو بالجبر نافذ کیا تھا ایسے ہی ڈاکٹر صاحب

بھی اپنے ذاتی فکر اور سوچ کو پاکستان کے مسلمانوں پر بالجبر نافذ و جاری کرنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ وہ اپنے خطبہ جمعہ میں فرماتے ہیں کہ اقامتِ دین کے لیے جزوی کوششوں میں وقت ضائع کرنا حماقت ہے اس کے لیے تو انقلابی عمل کی ضرورت ہے جو چھ مراحل پر مشتمل ہو گا (۱) انقلابی فکر کی اشاعت (۲) اس فکر کے حامل لوگوں کی تنظیم (۳) اس فکر کے حامل لوگوں کی تربیت (۴) اس فکر کو قبول کرنے والے منظم افراد کی وجہ سے معاشرہ میں کشمکش پیدا ہو گی وہ مقابلہ میں ہاتھ نہ اٹھائیں اور معاشرہ کے تشدد کو جھیل جائیں (۶) پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا مرحلہ آئے گا۔ (۶) آخر میں مسلح تصادم کی بات ہو گی۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی انقلاب مکمل نہیں ہوتا۔

(جنگ ۱۹ اپریل ۱۹۸۲ء)

یہ ہیں ڈاکٹر صاحب کے مجوزہ انقلاب کے وہ خدوخال جنہیں انہوں نے سولہ سال کے متواتر مطالعہ قرآن کے بعد قرآن کی روشنی میں طے کیے ہیں۔ اسی انقلاب کو پاکستان میں برپا کرنے کے لیے انہوں نے بیعت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ جسے وہ دینی بیعت کہتے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ خالص سیاسی بیعت ہے۔ کیونکہ دینی اور روحانی بیعت میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے اور آخر میں مسلح تصادم کا پروگرام نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب سیخ پا ہیں کہ ان کے تبلیغی بیانات پر تنقید کیوں کی جا رہی ہے حال ہی میں ایک اخباری بیان میں انہوں نے کہا ہے کہ ان کی مخالفت کی مہم میں افسر شاہی کا ایک با اثر گروہ سرپرستی کر رہا ہے اور یہ کہ اس گروہ کا نام لینا وہ مناسب

نہیں سمجھتے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ آپ اپنی ذاتی رائے کو قرآن کے نام پر پیش کرنے سے کیوں باز نہیں آتے، ٹیلی ویژن پر آنے کی وجہ سے لوگ آپکو عالم دین اور مفکر اسلام سمجھنے لگے ہیں اور آپ کے غلط سلط خانہ ساز نظریات سے عوام ذہنی انتشار کا شکار ہو رہے ہیں۔ آپ کتاب و سنت کے خلاف باتیں کرنا ترک کر دیں، علماء تنقید نہیں کریں گے۔ لیکن اگر آپ اپنے ذاتی افکار و خیالات کو قرآن کے نام سے پیش کریں گے اور پاکستان کے مسلمانوں کو بلا دلیل شرعی کافر و مشرک اور ملحد قرار دیں گے تو علماء کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ اس کا نوٹس لیں اور پاکستان کے مسلمانوں کو صحیح بات سے آگاہ کریں۔ رہی افسر شاہی کی سرپرستی تو اس کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے جو شخص بھی آپ کے کسی بیان پر افسر شاہی کے اشارہ پر یا آپ سے بغض و حسد یا اپنے ترفع یا ذاتی مفاد کی بنا پر تنقید و تبصرہ کرتا ہے تو اس پر اللہ کی اس کے رسول کی اور اس کے فرشتوں کی لعنت ہو۔

البتہ آپ کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ آپ افسر شاہی کے اس گروہ کو بے نقاب کریں۔ آپ تو اینٹ کا جواب پتھر سے اور آخر میں مسلح تصادم کی بات کرنے سے بھی نہیں ڈرتے اس گروہ کا نام لینے سے کیوں ڈرتے ہیں؟

گذشتہ دنوں بیگماتِ پاکستان نے الہدیٰ پروگرام کو بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا ظاہر ہے کسی بھی دینی پروگرام کو بند کر دینے کا مطالبہ قرآن اور دینِ اسلام سے محبت رکھنے والوں کو زیب نہیں دیتا۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ کوئی مسلمان بحیثیتِ مسلمان قرآن و سُنت پر مبنی پروگرام کو بند کرانے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ کسی دینی پروگرام کے مقرر کے خیالات سے دلائل شرعیہ کی روشنی میں اختلاف ہو تو اس کا اظہار

معیوب نہیں ہے۔ لاہور کے ایک صاحب نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی تفسیر قرآن میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک تفسیری تقریر پر جناب محترم علامہ مفتی غلام سرور صاحب قادری ایم اے اسلامیات شیخ الحدیث جامعہ قادریہ رضویہ گلبرگ نے ایک طویل مقالہ تحریر فرمایا ہے جس کے کچھ حصے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب جہاں بھی موقع پاتے ہیں، وہاں اپنے ذاتی اور قلبی خیالات کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہر ذی شعور کو معلوم ہو گی۔ راقم اس کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ ۱۲ فروری کو عشاء کے وقت ڈاکٹر صاحب نے سورہ فرقان کی آیت ۶۸ کی تفسیر فرمائی۔ اس میں شروع میں آتا ہے "وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ" اس کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے اس طرح کیا ہے "اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ دوسرے خُدا کو نہیں پکارتے" اس کے بعد موصوف نے موقع پا کر غیر اللہ کو پکارنے کی مذمت فرمائی اور فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لیے پکارنا اور استغاثہ کرنا شرک ہے۔ جبکہ قرآن کی اس آیت کا غیر اللہ کو پکارنے اور غیر اللہ سے مدد چاہنے کے مسئلہ سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ جو معنی ڈاکٹر صاحب نے یہاں کئے ہیں اگر ان معنوں کو قرآن کی معنوی تحریف اور جعلی تشریح قرار دیا جائے تو بجا ہوگا۔ جن حضرات کو قرآنی علوم پر عبور ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے ان معنوں کو سن کر ضرور پریشان ہوتے ہوں گے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ و تفسیر قرآن کرتے ہوئے اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ترجمہ قرآن و تفسیر قرآن کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار کیا ہے؟ اگر اس معیار کو سامنے

رکھا جائے تو ترجمہ و تفسیر کرنے والا قرآن کی معنوی تحریف اور جعلی تشریح کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا معیار اسلاف کا ترجمہ و تفسیر ہے جسے تفسیر بالمنقول کہتے ہیں۔ وہ بحمدہٗ تعالیٰ ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر اسلاف کے کیے گئے معنی و مفہوم کو مدِنظر رکھ کر قرآن کی تفسیر و ترجمہ کیا جائے تو کسی کے نزدیک قابلِ اعتراض بات نہ ہو اور نہ ہی خواہ مخواہ اختلاف و انتشار کی فضا پیدا ہو۔ حدیث میں قرآن کے من گھڑت معنی کرنے کی سخت مذمت آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی۔ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں سمجھے اور یہ محض اپنی ذاتی رائے سے قرآن کی تفسیر کرنے والوں کا ———— ہی خاصہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں دَعَا یَدْعُوْ کے الفاظ کسی نہ کسی صورت میں وارد ہوئے ہیں۔ یہ حضرات ان کا معنی پکارنے کا کرتے ہیں۔ اور اس سے مقصد ان مسلمانوں کو خواہ مخواہ مشرک ٹھہرانا ہے جو بزرگانِ دین انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے پکارنے اور ان سے روحانی امداد حاصل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں، یا رسول اللہ یا علی اور یا غوثِ اعظم کا نعرہ بلند کرنے اور انہیں روحانی امداد کے لیے پکارتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کے پاس قرآن کریم، سنت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع امت ایسے ٹھوس دلائل بھی ہیں جن کا سامنا کرنا کسی منع کرنے والے صاحب کے بس کی بات نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دعا یدعو کے ہر جگہ "پکارنے" کے معنی نہیں ہیں اور نہ ہی غیر اللہ کی ہر پکار شرک ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ "دعا یدعو" کے الفاظ ———— قرآن میں چھ مختلف معنوں میں استعمال ہوا۔ جیسا کہ امتِ محمدیہ کے عظیم امام و مفسر و محدث امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ الاتقان میں لکھتے ہیں کہ لفظ دعا کبھی تو عبادت کے معنوں میں استعمال

ہوتا ہے اور کبھی مدد چاہنے کے معنی میں کبھی سوال کرنے کے معنی میں کبھی قول کبھی پکارنے اور کبھی نام لینے کے معنی ہیں (ملاحظہ ہو الاتقان ج ۲ ص ۱۴۴) یہ کس قدر ستم کی بات ہے کہ ہر جگہ لفظ دعا کا ایک ہی معنی یعنی پکارنے کا کیا جائے اور موقع ومحل کی مناسبت کا قطعاً خیال نہ رکھا جائے۔ خاص کر اس آیت میں جو ڈاکٹر صاحب نے لا یدعون کے معنی پکارنے کے کرتے ہوئے اولیاء اللہ سے استغاثہ و استمداد اور انہیں پکارنے کو شرک ٹھہرایا ہے۔ بالکل تفاسیر کے خلاف اور قطعاً غلط ہے۔ اس سلسلے میں امام حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں "وَاللّٰہُ ینھاک بان تَعْبُدَ الْمَخْلُوْقَ وَتَدَعُ الْخَالِقَ" (ج ۳ ص ۳۲۶) یعنی اللہ تعالیٰ اس بات سے تمہیں منع فرما رہا ہے کہ تم مخلوق کی عبادت و پوجا کرو اور اللہ کو چھوڑ دو۔ امام ابن کثیر نے دراصل اس کی تفسیر میں حدیث نقل کی ہے اور یہ اس کی عبارت ہے۔ امام قرطبی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں اخراج لعبادہ المومنین من صفات الکفرۃ فی عبادتھم الاوثان (ج ۷ ص ۷۵) یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو کافروں کی بتوں کی عبادت کرنے کی حرکت سے بری قرار دے رہا ہے یعنی مسلمان ——— بتوں کی عبادت نہیں کرتے۔ امام قرطبی نے اس میں واضح فرما دیا ہے کہ لا یدعون کا معنی یہاں پکارنا نہیں عبادت کرنا ہے۔ اسی طرح امام ابن جریر طبری تفسیر طبری میں لکھتے ہیں کہ یہاں لا یدعون کا معنی ہے لا یعبدون (ج ۱۹ ص ۲۶) یعنی اس لا یدعون کا معنی ہے اللہ کے ساتھ دوسرے خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ سیّد المفسرین سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ لا یدعون کا معنی کرتے ہیں لا یعبدون (تفسیر ابن عباس ص ۲۲۸) یعنی عبادت نہیں کرتے اس سلسلے میں اس قدر حوالہ جات کافی ہیں۔ ورنہ تمام تفسیروں کے حوالہ جات دیکھ سکتے ہیں۔ اگر غیر اللہ کو "مطلقاً" پکارنا شرک ہوتا تو کوئی مسلمان بھی شرک سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور اگر مراد یہ ہو کہ غیر اللہ کو مدد کے لیے

پکارنا شرک ہے تو یہ ایک علیحدہ موضوع ہو جاتا ہے۔ جس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں اور اگر ڈاکٹر صاحب زبردستی اس موضوع کو یہاں گھسیٹ ہی لائے تو انہیں معلوم ہو کہ شروع سے یعنی صحابہ کرام سے لے کر اب تک مسلمانوں کا اس بات پر اجماع و اتفاق رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مؤثر حقیقی و فاعل حقیقی اعتقاد کرتے ہوئے اور بزرگانِ دین کو وسیلۂ امداد و مظہرِ اعانتِ الٰہی قرار دیتے ہوئے ان سے استغاثہ کرنا اور ان کو امداد کے لیے پکارنا جائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ کی کتابوں میں سے مشہور کتاب فتاویٰ خیریہ میں امام خیر الدین الرملی الحنفی متوفی ۱۰۸۱ھ ارشاد فرماتے ہیں یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کہنا جائز ہے۔ کیونکہ یہ پکار محض ہے اور اللہ کے لیے ان سے سوال ہے فما الموجب لحرمتہ تو اس کے ممنوع ہونے کی کوئی شرعی وجہ نہیں ہے (فتاویٰ خیریہ ج ۲ ص ۲۸۲) اسی طرح امام شمس الدین محمد بن امام شہاب الدین الرملی الشافعی متوفی ۱۰۰۴ھ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں۔

ان الاستغاثۃ بالانبیاء والمرسلین والاولیاء والعلماء والصالحین جائزۃ وللرسل والانبیاء والاولیاء والصالحین اِغاثۃٌ بعد موتہم لان معجزۃ الانبیاء وکرامات الاولیاء لا تنقطع بموتہم" فتاوی امام شمس الدین محمد الرملی الشافعی مع الفتاویٰ الکبریٰ ج ۴ ص ۳۸۲) یعنی انبیاء رسولوں، اولیاء وعلماء اور صالحین سے استغاثہ کرنا (ان کو امداد کے لیے پکارنا) جائز ہے اللہ کے رسول و پیغمبر و اولیاء وصالحین وصال کے بعد بھی مدد کر سکتے ہیں کیونکہ (وہ دنیا میں معجزہ وکرامت کی صورت میں بھی مدد کیا کرتے تھے تو) انبیاء کا معجزہ اور اولیاء کی کرامت ان کی موت سے منقطع نہیں ہو جاتی۔ یہ ہے وہ عقیدہ و مسلک جس پر اہل اسلام آج تک گامزن ہیں۔ مگر افسوس ڈاکٹر اسرار صاحب پورے اہل اسلام کو خود ساختہ خیالات کی روشنی میں مشرک ٹھہرانے پر مصر ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی انتہا پسندی

①

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اصلاحِ معاشرہ کے لیے جو روش اور انداز اختیار کر رکھا ہے وانتہا پسندی اور غلو و تشدد پر مبنی ہے۔ اصلاح معاشرہ کے لیے ایسا اندازِ تبلیغ نہ شریعت کو مطلوب ہے اور نہ ہی پسندیدہ۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تبلیغ اور نصیحت کے آداب میں حکمت اور موعظہ حسنہ کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف اس معاملہ میں جو انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ قرآن کی ہدایت کے خلاف ہی ہے

مثال کے طور پر شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے دعوتِ طعام دینے کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اللہ کے رسول نے نہ اس کا حکم دیا نہ کسی حدیث میں اس کا ذکر ہے اس لیے یہ ایک خواہ مخواہ کی بدعت ہے کیا یہ اصر و اغلال کے قبیل کی چیز نہیں ہے جن کے بوجھ سے انسانوں کی گردنوں کا آزاد کرنا مقاصدِ نبوت میں شامل ہے۔ دعوتِ طعام کھانے والوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ یقیناً یہ بڑی ہی دنائت اور سفلہ مزاجی کا معاملہ ہے۔ برات کا لفظ اور اس کا پورا تصور عجمی ہے اس کا خالص نقشہ ہندوانہ ہے بلکہ بڑی کم ظرفی کا مظاہرہ ہے بہرحال شادی بیاہ کے سلسلہ میں وہ ناپاک تثلیث ہے جو مل جل کر ایک وحدت بن گئی۔ یعنی عیسائیوں کے قول کے مطابق توحید بھی اور تثلیث بھی۔ جہاں تک جہیز کا تعلق ہے یہ سراسر غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظہر ہے۔

(ٹریکٹ ایک اصلاحی تحریک ۲۶ / ۲۷ / ۲۸)

راقم الحروف کو شادی بیاہ کی رسومات کی حمایت مقصود نہیں ہے گذارش صرف اس قدر ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے یہ اندازِ بے کیف اور یہ غلو و تشدّد کیا شرعاً درست ہے۔ پھر انتہا پسندی کی انتہا یہ ہے کہ بنام تبلیغ گالیاں بھی دی جا رہی ہیں۔ کیا دنائت سفلہ مزاجی، کم ظرفی کے الفاظ گالیوں سے کم درجہ کے ہیں؟ اسی طرح شادی کے موقع پر دعوتِ طعام کی تردید کو مقاصدِ نبوت میں شمار کرنا اور اصر و اغلال کی قرآنی اصطلاح (جس کے معنیٰ عام مفسرین نے توبہ کے طور پر اپنے آپ کو قتل کرنا۔ جن اعضاء سے گناہ ہوا ہے یا جس کپڑے یا بدن کے جس حصّہ پر نجاست لگی ہے اسے قینچی سے کاٹ ڈالنا وغیرہ مراد لیا ہے) کو لڑکی والوں کی طرف سے دی جانے والی دعوتِ طعام پر فٹ کرنا اور عیسائیوں کی تثلیث قرار دینا بدترین قسم کا تشدد نہیں تو اور کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب کو اصرار ہے کہ نکاح کا خطبہ اردو میں پڑھا جائے۔ کیونکہ خطبہ کی اصل غرض و غایت وعظ و نصیحت ہے۔ اس بات کو وہ سنجیدگی کے ساتھ بھی بیان کر سکتے تھے۔ مگر اس کے برعکس لکھتے ہیں کہ خطبہ نکاح کو ہم نے محض جنتر منتر بنا کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل غرض و غایت تذکیر و نصیحت ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ نکاح کے موقع پر جو خطبہ عربی زبان میں دیا جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء۔ قرآن مجید کی آیات حدیثِ نبوی اور دعائیہ کلمات پر مشتمل ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اسے جنتر منتر قرار دے رہے ہیں۔ کیا قرآن مجید کی آیات احادیث نبوی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پر مشتمل خطبہ کو جنتر منتر کہا۔ قرآن و حدیث کی توہین و تنقیص کے مترادف نہیں ہے؟ جبکہ احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اگر کوئی مسلمان قرآنی آیات کو اس کے معنے سمجھے بغیر سنے یا سنائے تو بھی اجر و ثواب

CS CamScanner

کا مستحق ہے البتہ معنیٰ جاننا اور پھر تلاوت کرنا نور علیٰ نور ہے ۔

جنگ ۔ لاہور ۔ ۳۰ ۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ جب تک ستر و حجاب کے اصولوں پر عملدرآمد نہ ہو اور بے حجابی اور ترغیب و تحریص کے عام مواقع ہوں تو اس صورت میں رجم اور کوڑے لگانے کی سزا صرف مجرم ہی نہیں بلکہ اسلام پر بھی ظلم ہے ، کیا زنا کے مجرم کے لیے رجم یا کوڑے کی جو سزا قرآن نے مقرر کی ہے وہ کسی خاص ماحول کے ساتھ خاص ہے ؟ کیا قرآن کے مطلق کو بلا دلیلِ شرعی مقید کرنا اور قرآن کے بیان کئے ہوئے کسی حکم کو ظلم قرار دینا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی توہین و تنقیص نہیں ؟

تعجب ہے کہ ایک طرف تو ڈاکٹر صاحب حالات اور ماحول کو یکسر نظر انداز کر کے یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ نجی اور سرکاری اداروں سے زنانہ عملے کو نہ صرف یہ کہ سبکدوش کر دیا جائے بلکہ ان کی اسامیاں ہی ختم کر دی جائیں اور دوسری طرف ماحول و حالات کا اس درجہ خیال کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی زنا کی سزا رجم یا کوڑوں کو ستر و حجاب پر عملدرآمد سے قبل نافذ کرنے کو ظلم قرار دے رہے ہیں ۔ اگر حکمِ قرآنی کے نفاذ کے لیے حالات و ماحول کی رعایت ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شرعاً ضروری ہے تو انہیں اپنی بیان کردہ اس منطق کی رو سے مستورات کو گھر میں قید کرنے کے متعلق بھی یہ کہنا چاہئے تھا کہ پہلے مستورات کی ضروریات زندگی کا اہتمام کیا جائے ۔ حکومت کے خزانہ سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ گذر بسر کر سکیں ۔ اس کے بعد حکم خداوندی حجاب کی ان سے پابندی کرائی جائے اور انہیں گھروں میں قید کر دیا جائے ۔

واضح ہو کہ بات اضطرار اور ضرورت شرعیہ اور حاجت شرعیہ کی نہیں ہو رہی گفتگو تو ان احکامات قرآنیہ کے متعلق ہو رہی ہے جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت یقینی اذعانی اور اجماعی ہیں اور جن کے نفاذ کے لیے قرآن نے وقت زمانہ اور ماحول کی کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی منطق کو تسلیم کر لیا جائے پھر تو کوئی بھی قرآنی حکم نافذ نہیں ہو سکتا۔

چور کی سزا قطع ید کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک ملک کے تمام باشندوں کی معاشی حالت درست نہ ہو جائے اور جب تک غریبی و محتاجی کا مکمل خاتمہ نہ ہو جائے اس وقت تک چور کو قطع ید کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ پھر یہ سلسلہ صرف قطع ید یا رجم یا کوڑوں کے نفاذ تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ بلکہ قرآن کے ہر حکم کو ڈاکٹر صاحب کی خانہ ساز منطق کی رو سے مسترد اور ظلم قرار دیا جا سکتا ہے (معاذ اللہ) چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی اسی منطق ناحق سے شہہ پا کر بعض نظام بینکنگ کے ماہرین یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اگر ملک سے سودی نظام کو ختم کر دیا گیا اور اسلامی حکم کے مطابق شرکت و مضاربت کو نافذ کر دیا گیا تو ملک کی معیشت اور بینکنگ کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۸ اپریل ۱۹۸۲ء

جامع الصفات

اس کتاب میں حضور کے فضائل و معجزات کا تذکرہ ہے اور آپ کے جامع جمیع ہونے پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیا کے معجزات پر تبصرہ کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضور جامع الصفات ہیں۔ یہ کتاب معجزاتِ نبویہ کا خزانہ ہے۔ قیمت : ۱۲ روپے

ڈاکٹر اسرار صاحب کی انتہا پسندی

۲

ڈاکٹر اسرار صاحب سے متعلق میرے ایک مراسلہ کا فیصل آباد کے محمد حسین اعوان صاحب نے جنگ ۱۷ اپریل میں جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ جواب کیا ہے سخت و شدید بد زبانی اور اپنے ممدوح کی طرح انتہا پسندی کا شاہکار ہی ہے۔ راقم کی کسی گرفت کا انہوں نے جواب نہیں دیا۔ صرف سخت کلامی سے کام لے کر اپنے دل کا غبار نکالنے کی کوشش کی ہے اور راقم کو سنّتِ رسُول کا منکر قرار دیکر توبہ کا مطالبہ بھی کیا ہے اگرچہ ایسی مجہول گفتگو کے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن بات چونکہ دین و مذہب کی ہے۔ اس لیے راقم شرافت کے ساتھ اپنی معروضات پیش کرنا اپنا دینی فرض سمجھتا ہے! اعوان صاحب نے جو گلفشانیاں کی ہیں۔ قارئین پہلے ذرا ان سے محفوظ ہو جائیں۔ کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے بے لاگ حق بات کہی ہے۔ دعوتِ ولیمہ لڑکی والوں کو نہیں کھلانی چاہئے۔ اس کا ثبوت نہ تو آپ اور نہ ہی آپ کے اصحابہ کے زمانہ میں ملتا ہے۔ اب کیا عرض کروں؟ اعوان صاحب کے علم و فضل کا عالم یہ ہے کہ اصحاب کو اصحابہ لکھ رہے ہیں۔ اور لڑکی والے شادی کے موقع پر جو دعوتِ طعام دیتے ہیں۔ اسے دعوتِ ولیمہ سے موسوم کر رہے ہیں۔ ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہے۔ سوال گندم جواب چنا دراصل اعوان صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں۔ جسے وہ نہیں کہہ سکے کہ لڑکی والے شادی کے موقع پر جو دعوتِ طعام دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت نہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پایا جاتا ہے اور نہ ہی صحابہ کرام کے دور میں اس لیے یہ

دعوت ناجائز و بدعت ہے گذارش یہ ہے کہ اگر ان کے بیان کردہ ضابطہ کی کوئی شرعی حیثیت ہے؟ —— تو سوال یہ ہے کہ شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرنا، ہوائی اڈے سے کار کے ذریعے اپنی کوٹھی تک پہنچنا۔ شوریٰ کے ایسے اجلاس میں شرکت کرنا جس میں مستورات بھی کھلے چہرہ جلوہ فرما ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پہ درسِ قرآن دینے کے لیے مبلغ دو ہزار روپے صرف فی پروگرام اجرت وصول کرنا۔ اعوان صاحب کے بیان کردہ ضابطہ کی روشنی میں ناجائز و بدعت ہونے چاہئیں۔ کیونکہ مذکورہ بالا کاموں کا ثبوت نہ تو دورِ نبوی میں ملتا ہے اور نہ ہی زمانۂ صحابہ میں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اعوان صاحب کے ممدوح ڈاکٹر صاحب کوئی ایسا کام کریں۔ جس کا ثبوت نہ دورِ نبوت میں ملے اور نہ زمانہ صحابہ میں وہ تو جائز قرار پائے اور اگر عوام ایسا ہی کوئی کام کریں تو وہ ناجائز و بدعت ہو جائے۔ اسی کو راقم انتہا پسندی کہتا ہے جو نہ دین کی تبلیغ ہے اور نہ شریعت کی خدمت دین کے معاملہ میں ایسے غلو و تشدد کی تو قرآن و سنت نے صریح طور پر ممانعت فرمائی ہے اپنے سابقہ مراسلہ میں راقم تصریح کر چکا ہے کہ شادی بیاہ کے موقع کی رسومات کی حوصلہ افزائی یا ان کی حمایت میرا مقصود نہیں ہے۔ میری تنقید تو غلو و تشدد کے انداز بے کیف سے متعلق ہے۔ اعوان صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کے کسی بھی فعل یا رسم کو ناجائز و بدعت قرار دینے کے لیے دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔ تمام آئمۂ اسلام مفسرین کرام و فقہاء امت اس امر پہ متفق ہیں کہ کسی فعل کا حدیث میں ذکر نہ ہونا یا کسی

کام کے متعلق حضور علیہ السلام کا کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی ہدایت نہ دینے کو اس امر کی دلیل بنانا کہ وہ فعل حرام و ناجائز اور بدعت ہے، شریعت اسلامیہ پر افتراء و بہتان ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس شدت کے ساتھ لڑکی والوں کی طرف سے دعوتِ طعام دینے کو ناجائز و بدعت قرار دیتے ہیں یہ نہ قرآن کی ہدایت ہے نہ رسول کا حکم بتائیے قرآن کی کونسی آیت ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے اور کون سی حدیث ہے۔ جس میں رسولِ کریم علیہ السلام نے اس دعوتِ طعام کو ناجائز و بدعت قرار دیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول نے اس دعوت کو ناجائز و بدعت نہیں قرار دیا تو آپ اور ڈاکٹر صاحب کون ہوتے ہیں ناجائز و بدعت کا فتویٰ دینے والے۔ جبکہ سورہ نحل کی آیت ۱۱۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور نہ کہو اسے جو تمہاری زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں یہ حلال ہے یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھو بیشک جو اللہ پہ جھوٹ باندھتے ہیں ان کا بھلا نہ ہوگا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سرزنش فرمائی ہے جو اپنے جی سے بلا دلیلِ شرعی مسلمانوں کے کسی فعل یا رسم کو حرام و ناجائز یا بدعت قرار دیتے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ حلال وہ ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال فرمایا اور حرام وہ ہے۔ جسے خُدا نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جن سے سکوت فرمایا وہ جائز و مباح ہے (ابنِ ماجہ)

اعوان صاحب مزید لکھتے ہیں کہ توبہ کے دروازے کھلے ہیں اللہ اور اس کے نبی کی سنت پر تنقید کرنا اور اپنے رسم و رواج کو بہتر سمجھنا کیا ہے یہ فیصلہ خود صاحبِ مضمون کرے اگر اس میں توفیق نہیں ہے تو کسی سے پوچھ لے۔ جواباً گذارش ہے کہ راقم نے اپنے مراسلہ میں نہ تو معاذ اللہ سنتِ رسُول

CS CamScanner

پر تنقید کی ہے اور نہ ہی عوام کے رسم و رواج کو سنتِ رسول سے بہتر قرار دیا ہے جو شخص ایسا کہتا یا عقیدہ رکھتا ہے۔ بیشک وہ گمراہ و بیدین ہے لیکن جو بلا سوچے سمجھے غلط الزام لگاتا ہے۔ وہ بھی جھوٹا ہے اور جھوٹوں پہ اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے

رہی یہ بات کہ دعوتِ ولیمہ سنت ہے اور لڑکی والوں کی طرف سے جو دعوت دی جاتی ہے۔ وہ سنت نہیں ہے تو اس کے متعلق گذارش ہے کہ دین کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ جو کام سنت ہے بے شک اس پہ عمل کرنا کارِ ثواب ہے لیکن جو کام یا فعل سنت نہیں ہے۔ اس کام یا فعل کا ناجائز و بدعت ہونا ضروری نہیں ہے۔ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بلکہ اس سے بھی زیادہ ایسے کام ہیں۔ جو ہم اور آپ اور ڈاکٹر صاحب کرتے ہیں۔ مگر وہ سنتِ رسول نہیں ہیں۔ مگر سنتِ رسول نہ ہونے کے باوجود پھر بھی جائز و مباح ہیں۔ اور ایسے کاموں کو اپنے جی سے ناجائز و حرام یا بدعت قرار دینا نہ صرف یہ کہ شریعت پر افترا و بہتان ہے بلکہ سخت و شدید گناہِ کبیرہ ہے۔

اہلِ علم کی خدمت میں بصد ادب گذارش ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا بیان کردہ یہ ضابطہ کہ جو فعل یا رسم سنت نہیں ہے یا جس فعل یا رسم کا ثبوت زمانہ نبوت اور دورِ صحابہ میں نہیں ملتا۔ وہ ناجائز و بدعت ہے نہ صرف یہ کہ قرآن و حدیث کی رو سے غلط اور باطل ہے بلکہ عقلاً بھی فاسد و کاسد ہے اس کے ثبوت میں ایک نہیں سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ چند پہ غور کیجئے۔

(۱) ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر درسِ قرآن دینا (۲) کالے رنگ کی قراقلی ٹوپی پہننا۔
(۳) شیروانی زیبِ تن کرنا۔ جیسی کہ ڈاکٹر صاحب بھی پہنتے ہیں۔ مسجدیں پختہ بنانا

اور ان کی آرائش کرنا (۵) رہنے کے لیے پختہ اور عالیشان مکان بنانا (۶) مسواک کی جگہ دانتوں کی صفائی کے لیے نائیلون کے برش استعمال کرنا (۷) میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا تناول کرنا (۸) شوریٰ کے اجلاس میں پاکستانی ترانے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جانا (۹) یوم پاکستان، یوم اقبال۔ یوم قائد اعظم، شام ہمدرد کی مجالس کا انتظام کرنا اور ان مجالس میں مہمانِ خصوصی بننا سینکڑوں ایسے اعمال و مراسم ہیں۔ جو سنت نہیں ہیں۔ تو کیا محض سنت نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب افعال اور مراسم مروجہ ناجائز و بدعت قرار پائیں گے؟ اور کیا ان افعال و مراسم سے روکنے کے لیے غلو و تشدد سے کام لینا اور فتویٰ کی زبان استعمال کر کے انہیں حرام و ناجائز قرار دینا انتہا پسندی نہیں ہے؟

ڈاکٹر صاحب کے نیاز مند اعوان صاحب نے یہ بھی سوال کیا ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب کی تبلیغ انتہا پسندی ہے تو اعتدال پسندی کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جن افعال اور مروجہ رسم و رواج کی قرآن و سُنت نے ممانعت نہیں فرمائی۔ انہیں اپنی ذاتی رائے سے حرام و ناجائز و بدعت نہ قرار دیا جائے البتہ اگر کچھ مروجہ رسم و رواج ایسے ہوں جو شرعاً جائز و مباح ہیں۔ مگر ان کی وجہ سے دشواری پیدا ہو رہی ہے۔ جیسے خصوصاً غریب ماں باپ کو لڑکی کی شادی کے موقع پر جہیز وغیرہ کی رسوم کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کہ ایک حقیقت بھی ہے تو ایسے امور کی اصلاح کے لیے نہایت شرافت اور مہذب انداز میں فتویٰ کی زبان میں نہیں۔ بلکہ اخلاق کی زبان میں تقریر و تحریر کے ذریعہ اصلاحِ احوال کی کوشش کی جائے یہ ہے اعتدال اور شرافت کا انداز اور اسی انداز کو قرآن

نے حکمت اور موعظہ حسنہ کے الفاظ کے ساتھ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے برعکس ایسے افعال اور مراسم جو شرعاً جائز و مباح ہیں۔ ان کی اصلاح کے لیے عیسائیوں کی تثلیث دنائت سفلہ مزاجی، خالص ہندوانہ ذہنیت، سراسر غیر اسلامی۔ جنتر منتر، ظلم و عدوان، اصر و اغلال ایسے کلمات استعمال کرنا جیسے کہ ڈاکٹر صاحب نے اصلاحی ٹریکٹ میں بنام تبلیغ استعمال کئے ہیں۔ شرعاً نہایت ہی مذموم اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر افتراء و بہتان باندھنے کے مترادف ہیں۔ ان کے اسی انتہا پسندانہ انداز پر راقم نے تنقید کی ہے جو شرعاً حق و صواب ہے راقم کو ڈاکٹر صاحب سے کوئی ذاتی عداوت یا رقابت نہیں ہے۔ ان کی تقریر و تحریر میں جو امور قرآن و سنت کے مطابق ہوں۔ کون مسلمان ہے جو ان سے اختلاف کرسکے۔ اگر کوئی صاحب بد زبانی سے نہیں کہ بد زبانی دلیل نہیں بلکہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں راقم کے نقطہ نظر کی غلطی واضح کر دیں تو بخدا مجھے اسے قبول کرنے بلکہ اس کا اعلان کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ بلکہ اپنی غلطی کو اگر وہ شرعاً غلطی ہو تسلیم کرنا ذلت نہیں عزت سمجھتا ہوں اور مخلصانہ تنقید و تبصرہ کی دلیل بھی یہ ہی ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کر کے حق بات کو قبول کر لیا جائے۔

نیز راقم نے دعوتِ ولیمہ جو کہ سنت ہے اس پر کوئی تنقید نہیں کی اور نہ یہ کہا کہ لڑکی والوں کی طرف سے جو دعوت دی جاتی ہے۔ وہ دعوتِ ولیمہ سے بہتر ہے۔ راقم نے تو ڈاکٹر صاحب کے حسبِ ذیل غلط اور خلافِ شرع کلمات پر تنقید کی ہے۔ جس کا متن یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بیاہ شادی کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے جو دعوتِ طعام دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ اللہ و رسول نے اس کا حکم دیا نہ کسی حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ خواہ مخواہ

کی بدعت ہے کیا یہ اصر و اغلال کے قبیل کی چیز نہیں جن کے بوجھ سے انسانوں کو آزاد کرانا مقاصدِ نبوت سے ہے۔ دعوت کھانے والوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ یقیناً یہ بڑی ہی دنائت اور سفلہ مزاجی کا معاملہ ہے۔ برات کا لفظ اور اس کا پورا تصور عجمی ہے اس کا نقشہ خالص ہندوانہ ہے۔ بلکہ بڑی کم ظرفی ہے۔ بہر حال شادی بیاہ کے سلسلہ میں یہ وہ ناپاک تثلیث ہے۔ جو مل جل کر ایک وحدت بن گئی۔ یعنی عیسائیوں کے قول کے مطابق توحید بھی اور تثلیث بھی۔ جہاں تک جہیز کا معاملہ ہے یہ خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظہر ہے (اصلاحی تحریک ۲۶-۲۷-۲۸)

اعوان صاحب سے کچھ کہنا تو بھینس کے سامنے بین بجانے کے مترادف ہے۔ مگر اہلِ علم کی خدمت میں عرض ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے دعوتِ طعام دینے کے متعلق۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ اندازِ تبلیغ یہ غلو و تشدد و انتہا پسندی کیا قرآن و حدیث کی رو سے درست ہے؟ کیا اصلاحِ معاشرہ کے لیے یہ اندازِ تبلیغ قرآن کی ہدایت کے مطابق ہے۔

اعوان صاحب نے راقم کی تنقید کا کوئی جواب نہیں دیا ہے بلکہ یہ لکھا کہ جہیز کا رواج ہندوانہ ہے اسلام و مذہب سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر یہ انتہا پسندی ہے تو پھر اعتدال پسندی کیا ہے (جنگ ۱۷ اپریل) میرا سوال یہ ہے کہ مطلقاً جہیز کو ہندوانہ رسم قرار دینا اور یہ کہنا کہ اسلام اور مذہب سے اس کا دور بھی واسطہ نہیں۔ اس کی دلیل شرعی کیا ہے؟ جہیز کو ناجائز و حرام قرار دینے کے لیے دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔ وہ دلیلِ شرعی پیش کیجئے۔ مسلمان اپنا سر جھکا لیں گے۔ مگر محض اپنے جی سے کسی بھی مروجہ رسم کو ناجائز قرار دینا اور غلو و تشدد سے کام لینا شرعاً درست نہیں ہے اصلاح احوال کے لیے شرافت

CS CamScanner

کے ساتھ بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی قابلِ غور و فکر ہے کہ مطلقاً جہیز کو ہندوانہ رسم کہنا اور حرام و ناجائز کا فتویٰ لگانا اور ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ میرے نزدیک جہیز سراسر غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظہر ہے۔ اگر آپ کے نزدیک شرعاً صحیح و درست ہے تو آپ کے ممدوح ڈاکٹر صاحب بھی اپنے فتویٰ کی زد سے نہیں بچ سکتے چنانچہ وہ خود تصریح کرتے ہیں کہ میری ایک اٹیچی بھر کپڑے اور سوا دو تولہ کا طلائی زیور لے کر میرے گھر سے رخصت ہوئی (ٹریکٹ ص ۳۲ تو ایک اٹیچی بھر کپڑے اور سوا دو تولہ سونا تو ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی بیٹی کو بطور جہیز دیا ہے تو ڈاکٹر صاحب کا یہ عمل سراسر غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظاہرہ نہیں قرار پائے گا۔

علامہ شبلی نے سیرۃ جلد ۲ ص ۲۸۴ پر لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب فاطمہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جہیز میں ایک پلنگ ایک بستر ایک چادر دو چکیاں اور ایک مشک دی تھی۔ قلم لرزتا ہے کہ اس موقع پر کیا عرض کروں؟ کیا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مقدس صاحبزادی کو جو جہیز دیا یہ معاذ اللہ، معاذ اللہ، معاذ اللہ ہندوانہ رسم، اسلام کے سراسر خلافِ عمل اور ہندوانہ ذہنیت کا مظہر تھا؟ جہیز دینے کی رسم تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہوگئی اس لئے جہیز کو مطلقاً ہندوانہ ذہنیت کا مظاہرہ قرار دینا اور اسے سراسر غیر اسلامی قرار دینے سے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک بھی محفوظ نہ رہ سکے گی۔

الغرض اپنی وسعت و طاقت کے مطابق جہیز دینا نہ صرف یہ کہ جائز و مباح ہے بلکہ سنتِ رسول بھی ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب اور اُن کے ہم نوار انصاف و دیانت اور خدا خوفی کے ساتھ غور کریں کہ رسولِ کریم علیہ السلام کی سنت (جہیز) پر تنقید اور اسے سراسر غیر اسلامی اور ہندوانہ ذہنیت کا مظہر ڈاکٹر صاحب نے قرار دیا ہے یا راقم نے؟

اللہ تعالیٰ ایسی انتہاپسندی سے ہر مسلمان کو محفوظ و مصئون رکھے۔

خطبۂ نکاح جو کہ قرآنی آیات، حدیث نبوی، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور دعائیہ کلمات پر مشتمل ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اسے جنتر منتر کہا تھا۔ ۸ اپریل کے جنگ میں راقم نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ عربی کے ایسے خطبہ کو جنتر منتر کہنا بہت زیادتی ہے۔ اعوان صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا بلکہ ڈاکٹر صاحب کی بلا دلیلِ شرعی تائید کی ہے۔ البتہ نکاح سے متعلق ایک ایسا عجیب و غریب مسئلہ بیان کیا ہے جو ابتداءِ اسلام سے لے کر آج تک نہ کسی نے کہا اور نہ سُنا۔ اعوان صاحب (بوقتِ نکاح (جو عربی زبان میں خطبہ پڑھا جاتا ہے کو) نکاح کا رُکن قرار دیتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

خطبہ نکاح عام خطبہ نہیں۔ یہ تو خاص موقع پر پڑھا جاتا ہے یعنی نکاح کے وقت دو انسانوں کو ایک دوسرے کو اپنے اوپر حلال کرنے کے لئے یعنی یہ حکم اللہ، خطبہ نکاح دونو مرد و عورت کو ایک، دوسرے پر حلال قرار دیتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ خطبہ کے معنی کو سمجھا جائے۔ (جنگ، ۱۱ اپریل ۱۹۸۲ء)

خطبہ کو نکاح کا رکن قرار دینا اور یہ کہنا خطبہ نکاح مرد و عورت کو ایک دوسرے پر حلال کرنے کے لئے پڑھا جاتا ہے اعوان صاحب کی مسائلِ نکاح سے ناواقفی اور جہالت پر مبنی ہے۔ خطبہ نکاح نکاح کا رکن یا شرط نہیں ہے۔ نکاح کے جائز و درست ہونے کے لئے تو صرف ایجاب و قبول اور دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر خطبہ نہ بھی پڑھا جائے تو بھی شرعاً نکاح صحیح و درست ہے اسی طرح نکاح کے شرعاً انعقاد کے لئے ڈاکٹر اسرار کا اردو خطبہ پڑھنا بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر بالغ مرد و عورت دو گواہوں کے سامنے ڈاکٹر اسرار کے خطبہ کی عدم موجودگی میں بھی ایجاب و قبول کر لیں تو ازروئے

شرع نکاح جائز و درست قرار پائے گا ـــــــ افسوس دینی مسائل پر ایسے لوگ بھی قلم اُٹھانے پر جری ہو گئے ہیں جنہیں نکاح کے معمولی مسائل سے بھی واقفیت نہیں ہے۔

جنگ ۸۔ اپریل میں راقم نے ڈاکٹر اسرار صاحب کے اِس بیان پر تنقید کی تھی۔ جس میں اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ برائیوں کی ترغیب و تحریص کے ماحول میں رجم و کوڑوں کی سزا دینا ظلم ہے۔ اعوان صاحب تنقید کا جواب تو نہ دے سکے۔ البتہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان کی تائید و توثیق کی بلکہ اس کی وضاحت میں ڈاکٹر صاحب سے بھی زیادہ انتہا پسندی کو اختیار کر کے قرآنی سزاؤں کو ظلم بتایا ہے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کا مقصد یہ ہے کہ وہ محرکات جن کی وجہ سے آدمی زنا کا مرتکب ہوا اور چوری کی وہ محرکات ختم کئے جائیں۔ جب ایسے اسباب موجود ہیں تو پھر سزا دینا ظلم کہلائے گا۔ یہ بات صاحب مضمون کی عقل میں کیوں نہیں آئی۔ (جنگ ۱۷۔ اپریل ۱۹۸۲ء)

تو صاحب! یہ بات عقل میں اس لیے نہیں آئی۔ کہ یہ بات ہے ہی عقل سے کوسوں دور۔ کیونکہ قرآن و سنت کے مطلق احکام کو بلا دلیل شرعی حالات و ماحول کے ساتھ مقید کرنا اور معاشرہ میں بے پردگی و عریانی کی موجودگی میں زانی کو رجم یا کوڑوں کی سزا دینے کو اور افلاس و غربت کی موجودگی میں چور کے ہاتھ کاٹنے کو ظلم قرار دینا نہ صرف یہ کہ خالص بے عقلی کی بات ہے بلکہ قرآن و سنت کے احکام کی توہین بھی ہے۔ اور کوئی بھی صاحب ایمان قرآن و سنت کی سزاؤں کو ظلم کے لفظ سے موسوم نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ بالا منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی روشنی میں تو قرآن و سنت کے ہر حکم کو روکا جا سکتا ہے اور ظلم قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ قرآن و سنت کی بیان کردہ سزائیں تو الگ رہیں۔ آج

CS CamScanner

دنیا بھر کے ممالک میں چوری، ڈکیتی، زنا بالجبر ایسے جرائم کے مرتکب افراد کو جو سزائیں دی جاتی ہیں انہیں بھی یہ کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے کہ جب تک ان جرائم کے اسباب و محرکات کا سدباب نہ ہو مجرموں کو سزا ہی نہ دی جائے۔ اگر دی جائے گی تو یہ ظلم ہے گویا اسراری و اعوانی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو نو من تیل ہو اور نہ رادھا ناچے۔

اعوان صاحب نے نہایت ناز و نخرے اور فخر کے ساتھ نہایت ذلت آمیز لہجہ میں قرآنی سزاؤں کو ظلم قرار دینے کے لئے کتے کی مثال بھی دی ہے لکھتے ہیں۔ وہ اسباب جن کی وجہ سے گھناؤنے گناہ پھیلتے ہیں وہ جوں کے توں رہیں۔ پھر گناہ کرنے والے کو سزا قرآن کے مطابق دی جائے۔ یعنی کتا کنوئیں میں رہے اور کہا جائے کہ پانی نکالو کنواں صاف ہو جائے گا۔ نہیں پہلے کتے کو نکالو پھر پانی نکالو۔ جب ملک میں زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی حکمرانی ہو گی، قرآن و سنت کا راج ہو گا اس وقت جو گناہ کی سزا ہو گی وہ عین اسلام کے مطابق ہو گی ورنہ ظلم ہو گا۔ (جنگ ۱۷۔ اپریل ۱۹۸۲ء)

قرآن و سنت کے احکام کے متعلق یہ اندازِ تحریر اگر کلمہ پڑھنے والے مدعی اسلام کا ہے تو بہت ہی تعجب ہوتا ہے۔ قرآن و سنت کے احکام خواہ ان کا تعلق جرائم کی سزاؤں سے ہو یا کسی اور شعبہ سے انہیں بلا دلیلِ شرعی حالات و ماحول کے ساتھ مقید کرنے کی جسارت ایسی مذموم حرکت ہے جس کی نظیر اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی اس عقل شکن نظریہ کا باطل و فاسد ہونا تو آفتاب سے زیادہ روشن ہے اگر اس ضابطہ کو صحیح و درست قرار دے دیا جائے تو پھر پوری شریعت کو معطل رکھنے کی راہ نکالی جا سکتی ہے اس طرح اعوان صاحب نے کنویں اور کتے کی جو مثال دی ہے وہ بھی غلط بے محل اور باطلِ محض ہے۔ اگر ملیریا میں مبتلا مریض کا ڈاکٹر علاج شروع کر دے تو کیا کوئی صاحبِ عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ پہلے بستی سے مچھروں کا مکمل خاتمہ کرو اس کے بع

مریض کا علاج کرو۔ مچھروں کے مکمل خاتمہ کے بغیر مریض کا علاج کرنا نہ صرف یہ کہ علم طب پر ظلم ہے بلکہ مریض پہ بھی ظلم ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس موقع پہ ہر عقل و خرد کا مالک یہ ہی کہہ سکیگا کہ مریض کا علاج تو ضرور کیا جائے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس مرض کے محرک مچھروں کے خاتمہ کی اور ان اسباب کے انسداد کی بھی کوشش کرنی چاہیے جو اس مرض کا سبب بن سکتے ہیں —— اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے آمین۔

ڈاکٹر اسرار ═══ دوسروں کی زبان سے

نسبت محترم میاں عبدالرشید صاحب (مدیر نورِبصیرت) نوائے وقت تحریر فرماتے ہیں۔ ہم قرآن پاک کو چومتے ہیں آنکھوں سے لگاتے ہیں اونچی جگہ پہ رکھتے ہیں اس کی طرف پشت نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ قرآن پاک کا ادب دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا ادب ہے۔

اسی طرح ہم جناب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام کرتے ہیں تو اس لیے کہ آنجناب اللہ تعالیٰ کے رسول اور محبوب ہیں۔ حضور کا احترام بھی فی الحقیقت اللہ ہی کا احترام ہے۔

نجاشی نے حضور کے نامۂ مبارک کا احترام کیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور اس احترام کے باعث عزت و برکت پائی۔

خسرو پرویز نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامۂ مبارک کی بے ادبی کی، اسے چاک کر دیا۔ وہ ذلیل ہوا اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

صحابہ کرام کا احترام بھی اس لیے ہے کہ وہ حضور کے صحابی ہیں انہیں حضور سے نسبت ہے۔

پاکستان مقدس ہے اس لیے کہ یہ اسلام کے نام پر اور اسلام کی خاطر وجود میں آیا۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ وہ مسجد کی نسبت کے باعث محترم ہو جاتی ہے۔ خواہ اس پہ مسجد کچھ وقت کے بعد بنے۔ اسی طرح پاکستان کی سرزمین محترم ہے، خواہ اس پہ مثالی مملکت بننے میں کچھ وقت لگ جائے۔

جنابِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں اسلامی مملکت مثالی تھی اور کچھ دیر تک اس کی یہی شان رہی۔ پھر انحطاط شروع ہوا پہلی عالمی جنگ کے بعد دنیائے اسلام کا زوال آخری نکتہ تک پہنچ گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اسلام کے عروج کا آغاز ہو گیا۔ انہی دنوں پاکستان وجود میں آیا اب ہم نے نیچے سے اوپر چڑھنا ہے اور اس میں وقت لگے لگا۔ مثالی اسلامی مملکت ایک دم وجود میں نہیں آ جائے گی۔

دورِ اوّل میں عربوں نے اسلام کو اپنا قومی مقصد قرار دیا تھا۔ اس دور میں پاکستان نے اسلام کو بطور قومی مقصد اپنایا ہے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ عربوں پہ زور دیتے تھے کہ وہ فتوحات کے دوران نئے ممالک میں جا کر اپنی عربی روایات پہ قائم رہیں۔ ہمیں بھی اپنی اچھی روایات قائم رکھنی چاہئیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد اگرچہ بعد میں آئے لیکن فکری انتشار پھیلانے میں وہ سب سے آگے نکل گئے۔ پہلے فرمایا مودودی صاحب نے سیاست میں آ کر غلطی کی تھی۔ پھر خود مجلسِ شوریٰ کا رُکن نامزد ہونا پسند فرمایا۔ حالانکہ مجلسِ شوریٰ بہر حال ایک عبوری سیاسی ادارہ ہے۔ پھر مجلس سے باہر بھی آ گئے اس دوران یہ بھی فرمایا کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ ملازمتیں نہیں کرنی چاہئیں انہیں ووٹ کا حق نہیں ہونا چاہئے اور اس طرح تعلیم یافتہ خواتین کو اسلامی نظام

سے برگشتہ کر دیا۔ پھر ارشاد ہوا کہ پاکستان کے جھنڈے کو اسلامی دنیا اور پاکستان کے ترانہ سننے کے لیے کھڑا ہونا شرک ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا" مگر ایسا کرنے والے مشرک نہیں اور محب پاکستان (ایسی باتوں سے) محب اسلام لوگ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ البتہ لادینی عناصر بڑے خوش ہیں کہ ان کا مقصد اسلام کے علمبرداروں ہی کے ہاتھوں پورا ہو رہا ہے اور انہیں خود کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تازہ ترین بیان کراچی سے موصول ہوا ہے۔ جو انہوں نے قرآن اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ امیر تنظیم اسلامی کی حیثیت سے دیا ہے اس میں ارشاد ہے اسلامی نظام کے نفاذ کا طریق کار انتخابی سیاست نہیں بلکہ انقلابی عمل ہونا چاہیئے اس میں آپ نے قیام نظام مصطفےٰ کے لیے تین نکات کو ضروری قرار دیا ہے۔ پہلا قرآن کی بنیاد پر دعوت۔ ماشاء اللہ یہ دعوت ڈاکٹر صاحب دے ہی رہے ہیں) دوسرا بیعت کی بنیاد پر تنظیم اور شخصی قیادت کی اہمیت (یہ کام تنظیم اسلامی کے امیر کی بیعت کرنے اور اس کی شخصی قیادت کی اہمیت تسلیم کرنے سے پورا ہو جائے گا) تیسرا نکتہ "جہاد پر مبنی تبلیغ ہے۔ ڈاکٹر صاحب جہاد پر مبنی تبلیغ کا آغاز بھی فرما چکے ہیں۔ خواتین نیز پاکستانی پرچم اور قومی ترانہ کے بارے میں ان کے ارشادات ان کی "جہاد پر مبنی تبلیغ ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے ۱۹۷۷ء کی تحریک قیام نظام مصطفےٰ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تنظیم اسلامی کی بنیاد انہی دنوں رکھی تھی اور سمن آباد ہی کے ایک مکان سے اس کا اعلان کیا تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب مسجد خضریٰ سمن آباد میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے۔ بہت سے لوگوں کو یاد ہوگا کہ عین ان دنوں جب

اس تحریک کے کارکن گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے اور خواتین کو بھی بے پناہ تشدد کا شکار بنایا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک خطبہ میں اس دور کے حکمران کی حمایت کی تھی اور نوجوانوں نے اس خطبے کے خلاف غم و غصہ کا اظہار بھی کیا تھا۔

فکری انتشار

جناب عشرت رحمانی صاحب لکھتے ہیں۔ سلیری صاحب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کو قائد اعظمؒ کی صفات اور تعلیمات کا پوری طرح علم نہیں اس سلسلہ میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی نسبت تو یہ بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف کو علم القرآن، فقہ و حدیث کے بارے میں مکمل واقفیت بھی ہے ؟ جس کا ثبوت خود ڈاکٹر اسرار صاحب کا جہیز کی رسم کے بارے میں فیصلہ کن بیان پیش کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ جہاں تک جہیز کا تعلق ہے یہ سراسر غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظہر ہے (ٹریکٹ بک یا اصلاحی تحریک ٢٦ / ٢٧ / ٢٨

محترم ڈاکٹر اسرار احمد جس رسم کو غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظہر فرماتے ہیں۔ اس رسم کی سند ہادیٔ برحق آقائے دوجہاں، سرور کونین حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ سے ملتی ہے۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوراق شاہد ہیں کہ حضرت خاتونِ جنت نورِ عین رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے حضرت علی مرتضیٰ کے ساتھ نکاح کے موقع پر اپنی لاڈلی صاحبزادی کو جہیز مرحمت فرمایا۔ اگرچہ اس میں قطعاً نمود و نمائش کو دخل نہ تھا۔ صرف بان ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا جس میں کھجور کے پتے بھرے تھے ایک چھاگل، ایک مشک دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے تھے اس سنت نبوی سے مسلمانوں کو جہیز کا جواز ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ سبق ضرور ملتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سادگی سے مسلمانوں کے لیے ایک روشن مثال پیش کی لیکن ڈاکٹر اسرار احمد ہوں یا کوئی بزرگ اگر جہیز کو ہندوانہ اور غیر اسلامی کہیں تو اس سے بڑھ کر ان کی لاعلمی اور

زیادتی و ظلم کیا ہوگا کہ سنتِ رسول کی نسبت (عیاذاً باللہ ثم عیاذ باللہ غیر اسلامی اور ہندوانہ رسم کے ناروا الفاظ استعمال کیے جائیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ ارشاد بجائے خود غیر اسلامی نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو بزرگ محترم پاکستان کے عام المسلمین کو قرآنی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے بزعم خود مدعی ہیں ان کی علمیت کا یہ حال ہے کہ وہ سیرت نبوی کے بارے میں بہت کم واقف ہیں تو قائد اعظم رح کے بارے میں ان کی لاعلمی کا کیا گلہ ہو سکتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جس جہیز کی رسم کو غیر اسلامی اور ہندوانہ فرماتے ہیں اس کو اپنے خاندان کے حق میں اس لیے جائز اور عین اسلامی سمجھتے ہیں کہ یہ خود ان کا فعل ہے گویا بقول شاعر ع

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

خود ہی ایک دوسرے بیان میں اپنی صاحبزادی کے عقدِ نکاح کی تقریب کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف نے فرمایا ہے کہ میری بیٹی ایک اٹیچی بھر کپڑے اور سوا دو تولہ کا طلائی زیور لے کر میرے گھر سے رخصت ہوئی (بحوالہ ٹریکٹ۔ تحریکِ اصلاح ص۳۲)۔

اب ڈاکٹر صاحب محترم خود ہی انصاف فرمائیں کہ اسی قول و عمل کے تضاد اور تعلیماتِ اسلامی کو مسخ کرنے کا نام تحریکِ اصلاح ہے

بہر حال یہ بحث تو درمیان میں جملۂ معترضہ کے طور پر محض ضمناً آگئی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے اس طرزِ عمل نیز دینی واقفیت کا جو اصلاحِ معاشرہ کے سلسلہ میں موصوف نے کچھ عرصہ سے اختیار کر کے محض عوامِ ملت کو خواہ مخواہ چونکانے کا غیر واجب انداز جاری کر رکھا ہے۔

امروز لاہور ۲۴ جون ۱۹۸۲ء

اے میرے سیّد!

حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا سیّد ابو البرکات قادری رحمۃ اللہ علیہ کی یاد اچانک شعر کے قالب میں ڈھل گئی اور یہ چند اشعار ارتجالاً زیرِ قلم آ گئے ـــــ ابو شاہد شبیر احمد شاہ ہاشمی

اے امام اہل سنت سیّد عالی وقار
جانشین شاہِ دیدارِ علی والا تبار

خواجۂ کون و مکاں کا وارثِ مسند تھا تو
تو نے کر ڈالا نبی کے نام پہ سب کچھ نثار

منکرینِ عظمتِ احمد سے تھا تو پنجہ زن
تیرے خامے نے کیا تھا سینۂ باطل فگار

تو سراپا ناز تھا روحِ غزالی کے لیے
تجھ سے پھر زندہ ہوئی تھی فضلِ حق کی یادگار

مظہرِ بوصیری و قدسی و جامی تھا تو ہی
اور رضا نے تجھ کو بخشا تھا محبت کا مینار

تو نے کھرچا نجدیت کو خطۂ پنجاب سے
اور ردائے اہرمن تجھ سے ہوئی تھی تار تار

تو کہ پنجہ زن ہوا تھا ہر بڑے فرعون سے
اہلِ جرأت اہلِ ہمت کا رہا تو تاجدار

تو نے بخشا تھا زمانے کو سرورِ سرمدی
تو نے اے ساقی دیا تھا جامِ الفت کا خمار

حضرت بوالخیر نور اللہ کو میرا سلام
تیرے شاگردوں میں شامل ہے یہ مردِ باوقار

حضرتِ محمود رضوی شارحِ قولِ رسول
ناشرِ فیضِ رسالت تیری اولادِ کبار

تیرے شاگردوں کا حلقہ شرق سے تا غرب ہے
تیرے دریوزہ گروں میں میں بھی ہوں اک ریزہ خوار

اس وطن کو تاکتا ہے آج سرخا سامراج
اس چمن میں اے پیارے ناچتے پھرتے ہیں خار

منکروں سے میں لڑوں گا تیرے گنبد کی قسم
اہلِ باطن کے اڑاؤں گا گریبانوں کے تار

خارجی و بدعقیدہ ناچتے پھرتے ہیں آج
اے میرے سیّد عطا ہو تیغِ حیدر کا وقار

تحریر: پروفیسر شاہ فرید الحق (قسط اوّل)

امام حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عملی زندگی

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دنیائے اسلام کے ایک ایسے درخشندہ ستارے ہیں۔ جن کی ضیا پاشیوں سے عالمِ انسانیت تا قیامت منور ہوتی رہے گی۔ تاریخ عالم میں ایسی ہمہ جہت شخصیّت خال ہی خال نظر آتی ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود ایک تاریخ مرتب کرتے ہیں اور موجودہ تاریخی دھارے کا رُخ موڑنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پہلی صدی ہجری کے آخری چوتھائی میں منظرِ شہود پر جلوہ گر ہوئے اور دوسری صدی ہجری کے نصف تک علم وفضل فقہ وفتویٰ تقویٰ وتقدس کے نیّرِ تاباں بن کر چمکتے رہے۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ شخص کہ ایک طرف علمی اور اجتہادی میدان میں اپنے تمام ہم عصروں پر سبقت لے جائے۔ دوسری طرف عملی حیثیت سے اس کا تقویٰ، پرہیزگاری دنیا کے لیے ضرب المثل بن جائے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے میں پہلی مرتبہ تقریباً پچاس ہزار افراد شریک ہوئے۔ پھر بھی کئی روز تک لوگ ان کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھتے رہے اور آج بھی بغداد میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔

امام اعظمؒ کی زندگی کا زیادہ ترحصّہ بنی اُمیّہ کے دورِ حکومت سے بھی متعلق رہا۔ امام اعظم کے سیاسی افکار وزندگی میں ان دونوں ادوار کا کافی اثر رہا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان دونوں خاندانوں کی حکمرانی کا سیاسی پس منظر مختصراً پیش کردیا جائے گا۔

اہلِ علم پر یہ بات عیاں ہے کہ مسلمانوں میں باہمی کش مکش اور دشمنی کا آغاز

شہادت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے شروع ہوا اس پاک ہستی کو جس ظالمانہ اور بہیمانہ انداز میں قتل کیا گیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی دردناک سانحہ ہے جو تلوار مسلمانوں کے درمیان میان سے باہر نکلی وہ آج تک اندر نہیں گئی ۔

اس خلیفہ راشد کے بعد ہی سے مسلمان آپس میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگے ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شہادت کے بعد سے حکومت اسلامیہ کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا ۔ حکومت اسلامیہ نے ملوکیت کا روپ دھارنا شروع کیا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد تو معاملات انتہائی نازک صورت اختیار کر گئے ۔ یزید اور اس کے کارناموں سے اسلامی نظم حکومت کو جو داغ لگا ہے اس کا دھلنا ممکن نہیں ہے خانوادہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ۔ مکہ اور مدینہ میں جو کچھ ہوا اس سے ہر ذی شعور مسلمان کی گردن ندامت سے جھک جاتی ہے یہ ایک اتنا عظیم المیہ ثابت ہوا کہ آج تک اس کا مداوا نہ ہو سکا ۔ مسلمانوں میں جو تفرقہ پڑا اس میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی گئی بہرحال بہرحال یزید اور اس کے بعد بنی امیہ کے حکمرانوں نے ماسوا حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جو کچھ کارنامے انجام دیئے ۔ ان میں اکثریت ایسے کاموں کی ہے ۔ جو قابل نفرت اور ملامت ہیں ۔ غور کا مقام ہے کہ بنی امیہ ہی کے دور میں مسجد نبوی میں سعید بن المسیب کے علاوہ ایک زمانے تک کوئی نماز پڑھنے والا نہیں تھا ۔ حجاج بن یوسف کی ظالم تلواروں نے لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کی گردنیں اڑا دی تھیں ۔ ان میں صحابہ کی اولاد اور جلیل القدر تابعین بھی شامل ہیں ۔ یزید ابن زیاد اور حجاج کے درباروں میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عزت اور عظمت کا مذاق اڑا گیا ۔ بلکہ ان کی تذلیل کی گئی ۔ اندازہ لگائیے کہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں صحابیٔ رسول جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ تشریف لا کر مدینہ منورہ کی زبوں حالی کی شکایت کرتے ہیں اور صلہ رحمی کی درخواست کرتے ہیں لیکن بجائے اس کے خلیفہ وقت ان کی عظمت کا خیال

کر کے ان کی گذارشات کو سنتا اور اس پر عمل کرتا۔ وہ غصہ سے لال پیلا ہوگیا۔ حضرت چونکہ نابینا تھے اس لیے اس کے چہرے کی ناراضگی کا پتہ نہ چلا۔ ایک دوسرے شخص نے یہ حالت دیکھ کر حضرت کو خاموش کر دیا اور باہر لے آئے اور سمجھانے لگے۔ حضرت یہ لوگ اب بادشاہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے کہا حضرت وہ سنتا بھی ہے اور نہیں بھی سنتا ہے۔ جو بات منشا اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ بس اسی کو سنتا ہے (ابن سعد) اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت کا تصوّر کس طرح آمریت اور ملوکیّت میں تبدیل ہو رہا تھا۔ یہ اس شخص کی کیفیّت کا عالم ہے جو ایک خاص مذہبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے بھی عجیب کرشمے ہیں۔ انہی امویوں میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ، جیسے خلیفہ راشد کو مبعوث فرما دیا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی جوانی کے زمانے میں بڑے تھوڑے عرصہ کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز خلافت پر متمکن ہوئے انہوں نے دورِ خلافت راشدہ کی یاد کو تازہ کر دیا۔ پہلے ہی خطبہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے الفاظ ادا کئے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہماری فرمانبرداری کوئی نہ کرے۔ اس سے پہلے لوگوں کا رجحان دینی علوم فقہ اور حدیث سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس خلافت میں پھر سے لوگ قرآن و حدیث، شریعت اور فقہ کی طرف مائل ہونے لگے، امام اعظم رضی اللہ عنہ، ان تمام حالات کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ ان کا رجحان پہلے تو علم کلام کی طرف ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنا سکہ جمایا باقاعدہ مناظرہ کرتے اور مخالفین کو شکست دیتے لیکن جب دینی رجحان ترقی پانے لگا۔ بدعتوں کے مٹانے کا فرمان جاری ہوا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کو زندہ کرنے کی سعی ہونے لگی تو امام اعظم نے علمِ کلام کو چھوڑا۔ فقہی مسائل پر غور و فکر شروع کر دیا۔ شرعی علوم کے حصول

کی جد و جہد میں مشغول ہو گئے ۔

امام اعظم کو اپنے کام میں منہمک ہوتے ہی سیاسی تبدیلی رونما ہو گئی ۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد ہی بنی امیہ کا پہلا دور لوٹ آیا ۔ نظام شریعت کا احیاء پھر رک گیا ۔ ظلم و بربریت لوٹ آئی ۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا ۔ جس کی آوارگی اور عیاشیوں کے قصوں سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں ۔ مسلمانوں کے بیت المال کو ذاتی ملکیّت قرار دے دیا گیا ۔ جس طرح امیر چاہتا خرچ کرتا ۔ مال و دولت کے بڑھانے کی فکر زیادہ ہو گئی ۔ اخراجات میں حدود کا خیال ترک کر دیا گیا ۔ یہاں تک کہ مالی ترقیوں کی ہوس میں اسلام کے تنزل کو گوارہ کر لیا گیا ۔ اسی دور میں اسلامی قوانین کی من مانی تشریح اور تعبیر خلیفہ کے مزاج کے مطابق ہونے لگی ۔ عدل و انصاف جو اسلامی عدالتوں کا طرۂ امتیاز تھا ۔ جہاں چھوٹے بڑے بادشاہ رعایا کی کوئی تمیز نہ تھی ، مفقود ہو گیا ۔ جب کہ قانون و انصاف کے متعلق حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "۔ میں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں میرا کام بحیثیت خلیفہ ہونے کے صرف نافذ کرا دینا ہے ۔ تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں ۔ لیکن میرا بازو زیادہ بوجھل ہے اور میری باز پرس زیادہ سخت ہے ۔ میں دین اور شرعی قانون میں کسی کمی بیشی کتر بیونت کا حق نہیں رکھتا ۔ بلکہ قانون جس حال میں ملا ہے ۔ اس کا اتباع ہی میرا فرض ہے "۔ قاضیوں کا تقرر بھی والیوں کی مرضی کے مطابق ہونے لگا ۔ اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا تھا کہ اب قاضی علم و فضل فقہ و قانون میں کوئی حیثیت بھی رکھتا ہے یا نہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی بجائے عدل و انصاف کے والی کی مرضی کے تابع ہو گئے ، یعنی عدالتی نظام کو انتظامیہ کے تحت کر دیا گیا ۔ حالانکہ خلافت راشدہ نے عدل و انصاف کے محکمہ کو انتظامیہ سے جدا رکھا ۔ یعنی عدلیہ انتظامیہ سے علیحدہ کر دی گئی تھی ۔ تفریق اختیارات کے ساتھ تحدید و توازن کے اصول کو بھی اپنایا گیا

CS CamScanner

تھا۔ یہاں اموی اور عباسی امراء نے اس سارے تصوّر کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ عدالتی معاملات پر خلفائے بنو امیہ و بنو عباس جب براہِ راست مداخلت کرنے لگے تو اہلِ علم و تقویٰ اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کرنے لگے۔ اگر زور و زبردستی سے کوئی اس منصب کو قبول بھی کرتا تھا تو وہ بھی باقاعدہ اس بات کا وعدہ لیتا تھا کہ حکومت یا خلیفہ عدل و انصاف کے معاملہ میں مداخلت نہیں کرے گا۔ جیسا کہ ابو جعفر منصور عباسی کے زمانہ میں قاضی شریح نے کیا لیکن عہد و پیمان کے باوجود قضا پر فائز افراد خلفاء کی بیجا مداخلت سے بچ نہ سکے۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے۔ ہر زمانہ میں یہ ہوتا آیا ہے انہیں اموی اور عباسی خلفاء کی ان بے اعتدالیوں اور غیر اسلامی اور غیر شرعی حرکات کو سراہنے والے علماء اور شیوخ موجود تھے۔ تاریخ میں بنی امیہ کے عہد کا یہ واقعہ درباری علماء اور شیوخ کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ یزید بن عبدالملک کے زمانہ میں چالیس شیخ پیش ہوئے اور انہوں نے اس بات کی شہادت دی کہ خلفاء سے قیامت کے دن نہ حساب لیا جائے گا اور نہ ان کو ان کے جرائم کی سزا ملے گی۔ اندازہ لگائیے۔ قرونِ اولیٰ میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اور اسی زمانہ میں امامِ اعظم ابو حنیفہ جیسا بطلِ جلیل بھی موجود تھا۔ جس کی حقانیت کی گونج بنی امیہ سے شروع ہو کر بنی عباس کے عہد تک جاری رہی اور اسی حق گوئی کی پاداش میں کوڑوں کی سزا سے نوازے گئے اور اسی راستے میں جان دے دی۔

تعجب تو اس بات پہ ہے کہ ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو انہی خیالات کی ترویج کرنے لگا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بادشاہ وقت کے ہاتھوں بے گناہ لوگوں کا قتل وغیرہ افعال ہو جائے اور اس کے خلاف آواز اٹھانا شرعاً صحیح نہیں۔ کن حالات میں ان محدثول نے ایسے خیالات کا اظہار کیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہرحال شدید تر حالات میں بھی امامِ اعظم سے متعلق ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ تاریخ میں یہ بات ملی ہے کہ امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان محدثین کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں تھے۔ داد و دہش کے

مختلف حربے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ مادی ضرورت لوگوں کو دسترخوان شاہی کی طرف مائل کر دیتی تھی۔ بعض مجبوراً اور کراہتاً کبھی کسی عہدے کو قبول کرتے تھے۔ جیسے قاضی شریک حکومت میں شریک ہوئے لیکن اسے دین فروشی بھی سمجھتے رہے اور حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ دیکھ رہے تھے کہ حکومت لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے کن کن ترکیبوں سے کام لے رہی ہے۔ جب تک پوری بے نیازی اور استغناء کا انتظام نہ کر لیا جائے ان کو نظر آ رہا تھا کہ بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل رہے ہیں۔ اسی بے نیازی اور استغنا کے حصول کے لیے امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ اپنی زندگی کے آخر وقت تک مشغول رہے یعنی بڑے پیمانہ پر وہ کپڑے کی تجارت کرتے رہے۔ تجارت کی تفصیل میں جانا تو طوالت ہے بہرحال اتنا ضرور ہے امام بالکلیہ مستغنی زندگی گذارتے تھے۔ بلکہ بہت سے لوگوں کے کفیل بھی تھے، داد و دہش بھی بڑے پیمانہ پر جاری اور ساری تھی۔ مقامی طور پر ہی تجارتی کاروبار نہیں تھا۔ بلکہ درآمد اور برآمد کا سلسلہ بھی قائم تھا۔

امام کی دیانت اور امانت اتنی مشہور تھی کہ کروڑوں روپوں کی امانت کے آپ امین تھے۔ امام اعظم کے سوانح نگاروں نے یہ بات بالاتفاق لکھی ہے کہ ” امام اعظم ابو حنیفہ کی جس وقت وفات ہوئی اس وقت ان کے گھر میں پانچ کروڑ روپے کی امانتیں لوگوں کی موجود تھیں۔ کسی حاجتمند کی حاجت کو انہوں نے رد نہیں کیا۔ ایسی صورت حال میں امام کا حکومت وقت کے آگے جھکنا محال تھا۔ ویسے بھی وہ بنی امیہ کے حکمرانوں سے خوش نہیں تھے۔ ان کی بداعمالیاں ان کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ جناب امام حکومت وقت کی داد و دہش سے اپنے کو الگ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے حکومت والوں سے کبھی کوئی پیسہ نہیں لیا۔ اللہ تعالیٰ نے خود انہیں اس قابل بنایا تھا کہ وہ سینکڑوں کو کھلا کر خود کھاتے تھے

آتنا مال و دولت ہونے کے باوجود رئیسانہ فخر و مباہات سے پرہیز کرتے تھے۔ البتہ لباس میں وہ خوش پوش مشہور تھے۔ وہ بھی اس لیے کہ وہ اپنے اللہ کے سامنے عبادت میں انتہائی اچھے لباس کے ساتھ پیش ہونا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ علماء کی جو شان ہوتی ہے۔ اس کا اس سے اظہار ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ خدا نے جو نعمتیں کسی کو بخشی ہیں اس کا اظہار بھی کیا جائے،

اس طرز زندگی سے ہی امام کے سیاسی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ وہ بنی امیہ کے حکمرانوں کی بے اعتدالیوں اور غیر شرعی حرکات سے نالاں تھے وہ ان کے سرکاری عہدے کو کسی حیثیت سے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہتری اور بھلائی کا درد امام موصوف میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہی درد بعض دفعہ انہیں ایسے کاموں پر بھی ابھارتا تھا جو غالباً دوسروں کی نظر میں قرین مصلحت نہ ہو جو مظالم بھی اہل بیت اور دوسرے مسلمانوں پہ ڈھائے گئے اس سے ان کو دلی کوفت تھی، مظلوموں کی شہادت کا ذکر سن کر بے اختیار رونے لگتے تھے۔ اہل بیت کرام سے ان کی محبت اور ان کا قلبی رجحان اس بات کی بین دلیل ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شریعت اور ان کے خانوادے سے غایت درجہ عقیدت رکھتے تھے اور حقیقتاً یہی ایمان کی پختگی کی دلیل ہے

۔ وہ خلفائے ثلاثہ کی عزت و احترام میں ذرہ برابر کمی کو گوارہ نہیں کرتے تھے اور یہی اہل سنت و جماعت کا مسلک ہے۔ بعض روایتوں میں یہ بات آتی ہے۔ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہ فوقیت دیتے تھے لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی بہرحال اتنی بات یقینی ہے کہ امام موصوف کا عقیدہ تھا کہ حضرت علی اپنی تمام

لڑائیوں میں حق پر تھے اور اس سلسلے میں وہ حضرت علی کے مخالفین کے متعلق کسی قسم کی تاویل کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ جو بھی جنگیں لڑی گئیں ہیں ان میں حضرت علی حق پہ تھے اسی طرح حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے متعلق فرماتے ”بلاشبہ حضرت علی امیر المومنین تھے انہوں نے حضرت طلحہ اور زبیر سے صرف اس لیے جنگ کی تھی کہ انہوں نے بیعت کرنے کے بعد ان کی مخالفت شروع کر دی تھی“۔

سیاسی اظہارِ خیال کا موقع اس وقت آیا۔ جب ہشام بن عبد الملک کے خلاف حضرت زید بن علی نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس زمانے میں کوفہ کا گورنر ابن النصرانیہ خالد بن عبد اللہ القسری تھا۔ اس گورنر نے تاریخی روایات کے مطابق شعائر اسلام کو ختم کرنے کی سعی کی کامل میں ہے ”اہلِ اسلام اس زمانے میں ذلیل تھے اور حکومت اہلِ ذمہ کے ہاتھ میں تھی۔ حالات بہت بدتر تھے۔ معاشی طور پہ بھی لوگ مفلوک الحال تھے۔ خالد کی داد و دہش کے قصے مشہور تھے اور اس کے عیش پرستانہ زندگی بھی اسلام اور اسلامی زندگی کا مذاق اڑانے کے لیے کافی تھی۔ امام موصوف کے زمانے میں خود ان کے وطن اور مستقر میں یہ تماشے ہو رہے تھے ”مسلمانوں پہ گورنر نے کافروں کو مسلط کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کی مسجدوں کے مینارے ڈھائے جا رہے ہیں اور عیسائیوں کے گرجے کی تعمیر مسلمانوں ہی کے پیسوں سے ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کے دین کے ساتھ تمسخر کیا جا رہا ہے یہ تو گورنر کر رہا ہے۔ خود خلیفہ اس فکر میں ہے کہ خواہ رعایا پہ کچھ بھی گزر جائے۔ لیکن اس کا اپنا مال بھلے اچھے داموں میں بک کر روپیہ کی شکل میں اس کے پاس پہنچ جائے۔ عام مسلمانوں کے گھر میں فاقہ ہے اور مسلمانوں کے امیر کا نوکر ایک بچے کی ختنہ میں وہ وہ الوالعزمیاں دکھا رہا ہے کہ شاید بادشاہوں کے لڑکوں کی ختنہ میں بھی اتنی زر مستیاں نہ دکھائی جاتی ہوں۔

مگر ساری دنیا چپ ہے بنی امیہ کی بے نیام تلوار نے خون کی جو ندیاں بہائی ہیں اور ظلم کے جو آتش کدے جوڑ رکھے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر بھلا کس کا گردہ اور کس کا جگرہ تھا کہ آہ تبسم کسی کے سوا کچھ اور بھی کرنے کو تیار ہو۔ مسلسل دیکھا جا رہا تھا کہ زبان سے بات نکلی نہیں کہ سر تن سے جدا ہو گیا (مناظر احسن گیلانی، ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی)

حضرت زید بن علی ان حالات کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے، ویسے بھی اہل بیت کرام میں ان کا مقام انتہائی بلند تھا۔ زہد و تقویٰ علم و عمل کے معاملہ میں اس وقت ان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔ خود امام اعظم ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا۔ جیسے ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ان کے زمانے میں ان سے زیادہ فقیہ آدمی کسی کو نہیں پایا اور ان جیسا حاضر جواب اور واضح گفتگو کرنے والا آدمی اس عہد میں مجھے کوئی نہ ملا روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس ہزار کوفیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن جب آپ باہر نکلے تو کل تین سو افراد آپ کے ساتھ تھے۔

حضرت امام موصوف کے شرکت نہ کرنے کے متعلق یہ روایت بیان کی گئی ہے اگر میں جانتا کہ لوگ آپ کو وقت پر چھوڑ نہ دیں گے اور واقعی راست بازی اور سچے عزم کے ساتھ ان کی رفاقت میں کھڑے ہوں گے تو میں ضرور ان کی پیروی کرتا، خلیفہ وقت کی بے اعتدالیوں اور منکرات کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا امام موصوف کا مسلک نہیں تھا لیکن وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی تعمیل کو ہر شخص کی تنہا ذات کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ اس کیلیے وہ اس کو بھی ضروری سمجھتے تھے کہ حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں اور لوگوں کا خون بے دریغ نہ بہے۔ حق کی آواز بلند کرنا بڑا جہاد قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ ابو داؤد اور ترمذی کی حدیث میں ہے۔ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا اظہار کیا جائے۔

CS CamScanner